علم سماجیات اور مطالعہ مذہب: نقد و نظر

SOCIOLOGY AND THE STUDY OF RELIGION: A CRITICAL ASSESSMENT

ضیاء الرحمٰن ضیاء* / ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل**

Abstract:
Sociologists' ideas about the causes and consequences of religion are scattered in a variety of studies, each of which focuses on a particular development in the relation of religion to social systems. The resulting literature thus generates a number of claims that appear to be competing and sometimes contradictory. This article mainly focuses on three major schools of thought within sociology and ideas presented by western sociologists about the social role of religion. The study reveals that, despite of their academic contribution in the field, the assumptions made by western sociologists and methods applied to the study of religion are facing serious academic challenges. They are partial and limited in their findings, particularly in their studies on Islam and Muslim societies.
Keywords: Sociology, Religion, Functionalism, Conflict, Inter-actionist, social change, westernization, modernization, materialism

۱۔ تمہید

سماجی علوم کا تعلق کسی بھی معاشرے میں موجود افراد کے رویوں کے منظم مطالعے اور مشاہدے سے ہے، یہ رویے انفرادی بھی ہوتے ہیں اور اجتماعی بھی۔ سماجی علوم کے تحت محققین ایسے مفروضے قائم کرتے ہیں جنہیں حقائق کی روشنی میں غلط یا درست ثابت کیا جا سکتا ہو۔ عمرانیات یا سماجیات (Sociology) سماجی علوم کی ایک اہم شاخ ہے جس میں انسان کی سماجی زندگی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ اپنے دائرہ کار کی وسعت اور موضوعات کے تنوّع کی وجہ سے عمرانیات کی دیگر سماجی علوم کے مقابلے میں حد بندی ایک مشکل کام ہے تاہم سماجیات کے دائرے میں آنے والے بڑے موضوعات میں معاشرتی نظم و نسق (Social Organization)، سماجی نفسیات (Social Psychology)، معاشرتی تبدیلی (Social Change)، انسانی ماحول (Human Ecology) مذہب (Religion)، وغیرہ اہم ہیں۔

---

*لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ و عربی، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

** ایسوسی ایٹ پروفیسر، شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

سماجیات میں مطالعہ مذہب کے مختلف مناہج میں سے چار زیادہ اہم ہیں: ۱۔ سماجی فعلیت پر مبنی نظریہ (Functional Approach) ۲۔ معاشرتی تبدیلی پر مبنی نظریہ (Social Change Approach) ۳۔ باہمی تصادم پر مبنی نظریہ (Conflict Approach) ۴۔ باہمی تعامل پر مبنی نظریہ (Inter-actionist Approach)۔ ان چار میں سے اول اور ثانی کو محققین سماجیات نے ایک ہی درجے میں شمار کیا ہے اور اس کی وجہ ان دونوں مکاتبِ فکر میں مذہب کے سماجی کردار کے بارے میں یکساں نکتہ نظر کا پایا جانا ہے۔ ان مکاتب فکر کے مطابق کسی خاص معاشرے اور تاریخ کے خاص مرحلے پر مذہب معاشروں کی سماجی ضرورت رہا ہے اور اس کا بنیادی وظیفہ سماجی وحدت (social cohesion) اور سماجی تبدیلی (social change) تھا جو کہ مثبت قدریں ہیں۔ اس طرح عملاً مذہب کے سماجیاتی مطالعہ میں مغربی نکتہ نظر کو سمجھنے کے لیے تین سماجیاتی مناہج ہی اہم ہیں: ۱۔ سماجی فعلیت کا نظریہ ۲۔ باہمی تصادم کا نظریہ اور ۳۔ باہمی تعامل کا نظریہ۔ یہ مضمون اِن تین مناہج کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔

۲۔ سماجی فعلیت پر مبنی نظریہ

جدید مغربی فکر میں مطالعہ سماجیات کے مناہج میں سے 'سماجی فعلیت' (functionalist approach) پر مبنی نظریہ وسیع تر معاشرتی تناظر پر مبنی فکر کی نمائندگی کرتا ہے، جس کے مطابق یہ سمجھا گیا ہے کہ 'ہر ذہنی عمل کسی نہ کسی ضرورت، اثر اور نتیجے کے اعتبار سے کار آمد سرگرمی یا تعامل ثابت ہوتا ہے'۔ اس نظریے میں معاشرے کو ایک جاندار (Living Organism) کے طور پر دیکھا گیا ہے جس کا ہر حصہ اس کے زندہ رہنے میں مدد دیتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق معاشرہ بھی ایک جسم کی طرح ہے جس کے مختلف اجزاء ہیں جو معاشرتی استحکام میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔[۱] 'سماجی فعلیت' پر مبنی نظریہ دو بنیادی مفروضوں پر قائم ہے۔ اول، معاشرہ ایک ادارے یا ڈھانچے کی مانند ہے جو اپنے ذیلی اداروں یا ڈھانچوں کے باہم ملنے اور تعامل کرنے سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ ذیلی سماجی ڈھانچے اپنے معاشرتی وظائف سرانجام دینے کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی ایک ذیلی ڈھانچے میں آنے والی تبدیلی دوسرے سماجی ڈھانچوں پر اثر انداز ہو کر معاشرتی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ اس نظریے کے حامیوں کا خیال ہے کہ 'سماجیات' کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ کیا چیز، کس حد تک ان سماجی ڈھانچوں پر اثر انداز ہو کر تبدیلی کا باعث بن رہی ہے۔ دوم، کسی بھی معاشرے میں قائم مضبوط سماجی ڈھانچے جو بظاہر کبھی نقصان دہ دکھائی دیتے ہیں حقیقت میں سماجی سرگرمیوں اور دیگر ذیلی ڈھانچوں کی بقاء میں اہم کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔[۲] ذیلی سماجی ڈھانچوں میں خاندان، معیشت، ریاست، مذہب، تعلیم، فنون لطیفہ، قانون وغیرہ نمایاں ہیں۔ اس نظریے کے تحت ہر ذیلی سماجی ڈھانچے کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ اپنا وجود ان عملی سرگرمیوں کی وجہ سے قائم رکھتا ہے جو لوگ مختلف حیثیتوں سے ان

سماجی اداروں کے تحت سر انجام دیتے ہیں مزید یہ کہ لوگوں کی مختلف سماجی حیثیتوں کا تعین ان قوانین کا نتیجہ ہے جو کسی بھی معاشرے کے عمومی اتفاق رائے سے وجود میں آتے ہیں۔[۳]

سماجی فعلیت پر مبنی نظریے کے مطابق مذہب بھی دیگر سماجی ادروں کی طرح ایک ادارہ ہے جو معاشرتی استحکام میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایمل درخائم (EmileDurkheim, 1858-1917) کے مطابق مذہب کوئی بھی ہو وہ اپنے ماننے والوں کو زندگی کا ایک تصور اور مقصد دیتا ہے۔ اس مقصد کے تحت ہر مذہب میں کچھ اخلاقی اقدار وجود میں آتی ہیں جنہیں معاشرے کے تمام افراد قبول کرتے ہیں۔ مقصدِ زندگی میں یہ وحدت سماجی وحدت میں ڈھل کر اجتماعیت کو استحکام بخشتی ہے۔ ہر مذہب میں کچھ انفرادی رسومات ہوتی ہیں اور کچھ اجتماعی۔ اجتماعی رسومات فرد کو یہ احساس دلاتی ہیں کہ اپنے جذبات و احساسات میں وہ اکیلا نہیں ہے۔ یہ احساس اسے گروہ کے ساتھ جڑے رہنے میں مدد دیتا ہے اور نتیجتاً سماجی وحدت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔[۴] تاہم اس مکتبہ فکر کے نظریہ ساز جدید دور میں مذہب کی افادیت کے قائل نہیں ہیں، ان کے بقول دورِ جدید میں قوم پرستی اور وطن پرستی مذہب کے متبادل بن گئے ہیں۔[۵]

مطالعہ سماجیات کے اس منہج کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس نظریے کے حامل محققین زیادہ تر سماجی ڈھانچوں کی دریافت اور ان کے بیان پر اکتفا کرتے رہے ہیں جبکہ اس نظریے میں پائی جانے والی بعض خامیوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس منہج کے محققین سماجی اداروں یا ڈھانچوں کے باہمی تعلق میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی کیفیت کے باب میں باہمی نسبت (correlation) اور باہمی اختلاف (co-variation) کو بنیاد بناتے ہیں۔ اس طرزِ تحقیق میں سماجی اداروں کا تین مختلف تناظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے: اول، خطی تناظر (linearperspective) جسے ہم باہمی تعلق کی 'راست متناسب' کیفیت سے موسوم کر سکتے ہیں یعنی اگر کسی ایک سماجی ڈھانچے میں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اسی نسبت سے دوسرا سماجی ڈھانچہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ ماہرین سماجیات تبدیلی کے اس باہمی تعلق اور مقدار کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوم، منحنی تناظر (curvilinear perspective) جس میں تغیر پذیر سماجی عناصر کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس میں ایک کے بڑھنے سے دوسرا بھی بڑھتا ہے مگر ایک خاص نکتے کے بعد یہ عمل معکوس ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں پہلے عنصر کے بڑھنے سے دوسرا عنصر کم ہونے لگتا ہے۔ سوم، کثیر الجہتی تناظر (multiple perspective) اس میں دو سے زیادہ سماجی اداروں کے باہمی تعلق اور آنے والی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اگر 'علم سماجیات' کے تحت ہونے والی تحقیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو یہ وہ کام ہے جو تقریباً سبھی سماجی محققین سر انجام دیتے رہے ہیں، اسے سماجی فعلیت پر مبنی نظریے (Functionalism) کا امتیاز قرار دینا درست نہیں ہو گا، جیسا کہ kinslay Davis نے اس کی نشاندہی کی ہے۔[۶] چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ منہج پہلے سے جاری تحقیقی عمل کو درست ثابت کرنے یا اس کی تائید

ہی کی ایک صورت ہے۔ اس منہج میں تحقیقی طریقہ کی خامیوں سے قطع نظر، اس مکتبہ فکر کے نظریہ سازوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کیا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں پائے جانے والے سماجی ادارے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ مثبت تعلق میں جڑے ہوئے نہیں ہوتے،[۷] یہی وجہ ہے کہ اس مکتبہ فکر کو انسانی معاشروں میں تصادم، عدم اتفاق، تنازعات اور انقلابات کو نظر انداز کرنے پر تنقید کا سامنا رہا ہے جو کہ ایسے معاشرتی پہلو ہیں جنہیں سماجی تجزیے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ اس مکتبہ فکر کو اس لیے بھی تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ یہ نظریہ ایک طرح سے حالات کو جوں کا توں (status quo) برقرار رکھنے کی مثبت توجیہہ پیش کرتا ہے چنانچہ معاشرتی تبدیلی کے لیے کوشاں سماجی تحریکوں کے اثرات اور ضرورت کو عموماً نظر انداز کر دیا گیا ہے نتیجتاً یہ نظریہ بقول ناقدین بالواسطہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوریت کا حمایتی نظریہ بن کر رہ گیا ہے جس کے مطابق جو جیسا ہے اچھا ہے۔ اس مکتبہ فکر کے مطابق 'جدیدیت' (modernization) سے مراد 'مغربیت' (westernization) ہے۔[۸] چنانچہ ان کے خیال میں کسی بھی معاشرے میں صنعت و حرفت، جو کہ ترقی و جدیدیت کی بنیاد ہے، پنپ نہیں سکتی اور نہ ہی قائم رہ سکتی ہے جب تک وہ معاشرہ اُن سماجی اداروں اور نظریات کو قبول نہیں کرلیتا جو مغربی معاشروں کی خصوصیات ہیں جیسا کہ مادیت پرستی (materialism)، مذہب اور ریاست کی علیحدگی (secularism)، جمہوریت (Democracy) ، آزاد مقابلے پر مشتمل معیشت (openmarket economy) اور شخصی مفادات کی اولیت (individualism) وغیرہ۔

۳۔ سماجی تصادم پر مبنی نظریہ

بڑی سطح (macro-level) پر انسانی سماج کی تفہیم میں مارکسی یا باہمی تصادم پر مبنی نظریے (Conflict Perspective) کو سماجی فعلیت پر مبنی نظریے کے متبادل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ کارل مارکس (Karl Marx,1818-1883 A.D.) کی اصل شہرت عالمی سطح پر سوشلسٹ تحریک کے بانی کے طور پر ہے جبکہ اس کی تحریروں کا بڑا مجموعہ اسی سوشلسٹ تحریک کے پروپیگنڈہ کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ مارکس کے انسان اور انسانی سماج سے متعلق پیش کیے گئے افکار کو عالمی سطح پر سماجیاتی مفروضوں سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تعصب جو 'سماجیاتی فعلیت' کے نظریے میں محض 'نظریے' تک محدود تھا اس کا دائرہ مارکسی سماجیات میں نظریے سے آگے بڑھتے ہوئے عملی سماجیات تک پھیل گیا ہے۔ چنانچہ باہمی تصادم کے مکتبہ فکر سے متعلق ماہرین سماجیات کارل مارکس کے نظریات سے براہِ راست استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کارل مارکس کی سماجیات دو بنیادی مفروضوں پر قائم ہے: اول، انسانی زندگی میں پائے جانے والے تحرّک کی بنیاد انسانی معیشت اور معاشی مفادات ہیں۔ دوم، انسانی معاشرے ہمیشہ طبقاتی کشمکش سے دوچار رہتے ہیں۔[۹] اس نظریے کے مطابق انسان کا معاشی مفاد دیگر تمام سماجی سرگرمیوں پر غالب اور ان کو وجود میں لانے نیز ان میں تحرّک کا باعث ہے

جیسا کہ خاندان، مذہب، قانون، فنون لطیفہ، سائنس اور اخلاقیات وغیرہ۔ یہ نظریہ انسانی تاریخ پر اپنے مقدمات قائم کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ذرائع پیداوار یا وسائل پر ہمیشہ سے ایک طبقے کی اجارہ داری قائم رہی ہے جبکہ معاشرے کے دیگر طبقات محض پیداواری عمل کا حصہ رہے ہیں نیز یہ طبقات وسائل پر قابض طبقے کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ اس طرح مارکس نے انسانی معاشروں کو دو گروہوں (classes) میں تقسیم کیا ہے: اول، وہ جو مالک ہیں اور دوسروں کا استحصال کرتے ہیں۔ دوم، وہ جو محکوم ہیں اور جن کا استحصال کیا جاتا ہے۔[۱۰] اس کے خیال میں کسی معاشرے میں ہونے والا مسلسل استحصال معاشرتی تبدیلی یا انقلاب کی راہ ہموار کرتا ہے۔ انسانی معاشروں کے تاریخی تناظر میں مطالعہ کے بعد مارکس نے سوشلزم کا نظریہ پیش کیا جو اس کے مطابق وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا حتمی حل ہے جس میں تمام لوگ تمام وسائل کے مالک ہونگے اس کے بعد معاشرے میں استحصال نہیں ہوگا اس لیے یہ ایک مثالی معاشرہ ہوگا۔ چنانچہ مزید کسی تبدیلی یا انقلاب کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ماہرین سماجیات جو اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں وہ براہ راست کارل مارکس کے فلسفہ حیات سے استفادہ کرتے ہیں چنانچہ ایک طرف انھوں نے اپنے سماجی مفروضوں کو حتمی نتائج کے طور پر پیش کیا ہے جیسا کہ؛ 'قانون' استحصال کرنے والے اپنے استحصال کے لیے وضع کرتے ہیں، یہی استحصالی طبقہ اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے مذہب کو پروان چڑھاتا ہے۔ باہمی تصادم پر مبنی نظریے کے مطابق مذہب معاشرتی کنٹرول (Social Control) کا کام کرتا ہے اور مذہب کا یہ کردار معاشرتی تبدیلی میں ایک رکاوٹ ہے۔ "مذہب معاشرے کے پسے ہوئے افراد کے ساتھ اُخروی زندگی میں کامیابی کا وعدہ کرکے دنیوی زندگی میں انہیں کسی بھی قسم کی معاشرتی تبدیلی کا حصہ بننے سے روکتا ہے۔ یہ صورت حال اقتدار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے حق میں جاتی ہے اس طرح مذہب کا سماجی کردار حالات کو جوں کا توں رکھنے (status quo) والا بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ مذہب حاکم اور مسلط شدہ گروہ کی اطاعت کا جذبہ مظلوم طبقوں کے ذہنوں میں راسخ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہٰذا سرمایہ دار اور مذہبی طبقہ ایک دوسرے کے مفادات کے نگہبان ہیں۔"[۱۲]

باہمی تصادم پر مبنی نظریے میں اس بات کو ایک سماجی حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسانی معاشرے ہمیشہ تصادم اور تنازعات میں گھرے رہتے ہیں اور اس مکتبہ کے مفکرین نے انسانی معاشروں میں پائے جانے والے اتفاق، اشتراک عمل اور باہمی تعاون کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس طرح استحصال اور تصادم کو بطور بنیادی انسانی سرگرمی کو کسی بھی معاشرے میں جاری نظام کی بنیاد تصور کر لیا گیا۔ دوسری طرف یہی ماہرین سماجیات اس رائے کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں معاشرتی استحصال اور باہمی تصادم کا خاتمہ صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ مغربی ماہرین سماجیات کا یہ رویہ اس دعوے کی نفی کرتا ہے کہ وہ اپنے سماجیاتی تجزیے میں غیر جانبداری اور معروضیت پر یقین رکھتے ہیں۔ دوسری طرف مارکسی ماہرین سماجیات کا یہ دعویٰ کہ تمام سماجی

ادارے طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں وجود میں آئے مجرد ایک مفروضہ ہے جس کے کوئی سائنسی شواہد پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے ادارے باہمی کشمکش کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں اور مستقبل میں بھی اس کا امکان ہے مگر سب کے سب سماجی اداروں کے بارے میں یہ کہنا محل نظر ہے۔ معاشروں کے تاریخی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرتی تبدیلی کے عوامل کبھی تو خود اس معاشرے یا فرد میں موجود ہوتے ہیں اور کبھی بیرونی دباؤ کے تحت بھی معاشرتی تبدیلی واقع ہوتی ہے،[۳۱] مارکسی سماجیات معاشرے کی اندرونی کشمکش کو تو بیان کرتی ہے مگر بیرونی عوامل کا ذکر نہیں کرتی۔ معاشرتی تبدیلی کی ایک صورت وہ بھی ہے جو تدریجاً وقوع پذیر ہوتی ہے جیسا کہ لوگوں کے اخلاقی رویوں، عادات اور طرزِ زندگی میں درجہ بدرجہ آنے والی تبدیلی جس کا مشاہدہ آج عالمگیریت کے زیرِ اثر دنیا بھر کے معاشروں کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے معاشروں میں بعض تبدیلیاں منصوبہ بندی، بتدریج اتفاق اور اشتراک سے حاصل کی جاسکتی ہیں جیسا کہ طرزِ سیاست اور طرزِ معیشت وغیرہ۔

مطالعہ سماجیات میں ان دونوں مناہج، سماجی فعلیت اور باہمی تصادم، کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مطالعہ سماجیات کی دو مختلف جہات کی نمائندگی کرتے ہیں لہٰذا دونوں ہی سماجیاتی تفہیم میں قابلِ قدر ہیں۔ جیسا کہ باہمی تصادم پر مبنی نظریہ معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کو سمجھنے میں زیادہ کارگر ہے جبکہ سماجی فعلیت کا نظریہ کسی معاشرے میں پائے جانے والے سماجی ڈھانچوں کو سمجھنے کے حوالے سے اہم ہے۔ باہمی تصادم کے نظریے کا حاملین نے اپنی توجہ زیادہ تر معاشرتی تنازعات اور سماجی تبدیلی کے عوامل پر مرکوز رکھی ہے کیونکہ وہ مارکسی فلسفے کے زیر اثر جوہری معاشرتی تبدیلی (Radical Change) کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ سماجی فعلیت کے مؤیدین کی معاشرتی تبدیلی میں دلچسپی کم تھی اور ان کی توجہ کا مرکز کسی معاشرے میں موجود سماجی ڈھانچے اور ان کی افادیت رہی ہے کیونکہ وہ سرمایہ دارانہ مغربیت کے زیرِ اثر معاشرتی استحکام اور سماجی ڈھانچوں کے مابین بہتر تعلق کے خواہاں دکھائی دیتے ہیں۔ مذکورہ مناہج کی علمی افادیت اپنی جگہ مگر مطالعہ سماجیات میں 'غیر جانبدارانہ' تحقیق پر کئی سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں کیونکہ ان مفکرین کی نظریاتی وابستگی ان کی تحقیقی ترجیحات کو واضح کرتی ہے۔ نظریاتی وابستگی کے زیرِ اثر ان میں سے ایک گروہ معاشرتی انتشار اور کشمکش کو جبکہ دوسرا گروہ معاشرتی استحکام کو اپنے مطالعہ کا موضوع بناتا ہے۔

انسانی معاشروں کو بادی النظر میں انہی دو کیفیتوں، انتشار اور اتفاق، سے واسطہ پڑتا ہے جو سماجی فعلیت اور باہمی تصادم کے نظریات کے تحت زیرِ بحث آئے ہیں مگر یہ دونوں مناہج، جو کہ معاشرے کا بڑی سطح (macro level) پر مطالعہ کر کے اپنے نظریات قائم کرتے ہیں، ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ نچلی سطح (micro level) پر افراد کے درمیان تعلق کی نوعیت اور کسی مخصوص صورت حال میں ان کی سماجی اہمیت کیا ہے۔ دیکھا جائے تو ان دونوں مکاتب فکر نے انسان کی شخصی دانش اور فیصلہ سازی کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا

ہے۔ ان کے لیے انسان محض کٹھ پتلیاں ہیں جو اِدھر اُدھر حرکت کرتے ہوئے پوری طرح بیرونی عوامل کے رحم و کرم پر ہیں۔ تاہم سماجیات کا کوئی بھی نظریہ مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ انسانوں کے باہمی تعامل کے قریبی مشاہدے پر مشتمل نہ ہو، کیونکہ انسان ہی وہ بنیادی پتھر ہیں جن سے ملکر کوئی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ فرد ہی ہے جو کسی سماجی 'عمل' میں شریک ہو کر اسے بامعنی بناتا ہے اور کبھی دیگر سماجی عوامل کی مزاحمت کرتا ہے اور کبھی ان سے ہم آہنگ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ فرد کی انفرادی حیثیت کو مرکز بناتے ہوئے سماجیات کے مطالعہ میں جدید مغربی فکر میں نظریہ باہمی تعامل (Inter-actionist Approach) معروف ہے جس میں انسانی معاشروں کا نچلی سطح (micro-level) پر تجزیہ کیا جاتا ہے۔

۴۔ باہمی تعامل پر مبنی نظریہ

'باہمی تعامل' پر مبنی نظریے کے مطابق انسان کی اجتماعی زندگی کو سمجھنے کے لیے نچلی سطح (micro level) پر انسانوں کے باہمی میل جول (Interaction) کو مدّ نظر رکھا جانا چاہیے کیونکہ انفرادی سطح پر وجود میں آنے والا یہ میل جول اور باہمی اظہار کے مختلف طریقے ہی بڑی سطح (macro level) پر نظر آنے والے اجتماعی رویوں کی بنیاد ہیں۔[۱۴] باہمی تعامل کے نظریے سے مراد سماجیاتی مطالعہ کا ایک ایساڈھانچہ ہے جس میں انسانوں کو ایسی دنیا کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے جو بامعنی اشیاء سے بنی ہوئی ہے۔ ایسی اشیاء (objects) جن کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے، ان اشیاء میں مادی چیزیں، انسانی اعمال، اظہار کے مختلف طریقے، افراد اور ان کے تعلقات، مختلف مذہبی و سماجی علامات ہو سکتی ہیں۔[۱۵] اس مکتبہ فکر کو 'علامات پر مبنی باہمی تعامل کا نظریہ' (Symbolic Inter-actionist Perspective) کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔اس نظریے کے مطابق مذہب بھی انسانوں کے باہمی میل جول سے وجود میں آیا ہے اور تاریخ کے مختلف ادوار اور سماجی تبدیلیوں کے نتیجے میں پروان چڑھا ہے۔ مذہبی عقائد، مذہبی علامات اور رسومات پر انسانوں کا اتفاق ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں یہ معاشرے کو الگ شناخت دینے کا کام کرتی ہیں۔ مگر مذہبی علامات کے معانی میں تبدیلی ایک سماجی عمل ہے کیونکہ ہر دور کا انسان اپنی ضرورت کے مطابق باہمی میل جول سے مذہبی علامات کے معانی کو تبدیل کرتا رہا ہے جس کی سب سے بڑی دلیل ایک ہی مقدس تحریر کی مختلف تشریحات کا پایا جانا ہے۔ کیونکہ ہر تشریح کسی خاص شخصی فکر یا ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے جو خاص وقت اور مقام کی پابند ہوتی ہے۔[۱۶]

مطالعہ سماجیات کا یہ منہج دیگر جدید مغربی مناہج کے مقابلے میں نظریاتی اعتبار سے کم متعصب یا کم جانبداری کا حامل ہے کیونکہ اس منہج میں 'نظریے' پر 'فرد' کو ترجیح دی گئی ہے۔ فرد کو پہلے سے قائم شدہ کسی نظامِ فکر میں رکھتے ہوئے سمجھنے کی بجائے خود فرد کے اپنے نکتہ نظر سے اس کی سماجی سرگرمیوں کو سمجھا گیا ہے۔ اس منہج کی خامی یہ ہے کہ افراد میں موجود فیصلہ سازی کی صلاحیت کے بارے میں اس کا نکتہ نظر فرد تک محدود ہے

جس کے مطابق عامل یعنی فرد یا انسان خود ہی اس کی وجہ ہے چنانچہ ہر عامل (انسان) خود ہی اپنے عمل کا پیدا کرنے والا ہے نیز وہ خود ہی اس کا ذمہ دار بھی ہے۔ فعالیت پر مبنی نظریے (Functionalism) اور باہمی تصادم پر مبنی نظریے کے مقابلے میں جہاں فرد سماجی اعتبار سے بے بس نظر آتا ہے یہ نظریہ فرد کے نکتہ نظر سے سماجی صورتِ حال کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دیگر مکاتب فکر کے مقابلے میں باہمی تعامل پر مبنی نظریے کو اس اعتبار سے بھی غیر سائنسی سمجھا گیا ہے کیونکہ یہ انسانی سرگرمیوں کو ایک طرح سے غیر یقینی کی صورت حال سے تعبیر کرتا ہے جن کے بارے میں کوئی بھی پیشین گوئی نہی کی جاسکتی نیز یہ کسی بھی سماجی عمل کی توجیہہ اس کے عامل کے نکتہ نظر سے کرتا ہے جس میں غیر جانبدارانہ تجزیے کے امکانات محدود ہیں۔

مغربی نظریات کے اس عمومی جائزے کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماجی فعلیت (FunctionalistApproach) اور سماجی تصادم (Conflict Approach) پر مبنی نظریات واضح طور پر جبکہ باہمی تعامل (Inter-actionist Approach) پر مبنی نظریہ غیر واضح انداز میں 'مذہب' کو خود انسان کی پیداوار اور دیگر سماجی سرگرمیوں کے مساوی ایک سرگرمی قرار دیتا ہے۔ سماجی فعلیت کے نمائندہ مفکرین نے درخائم کی اقتداء میں مذہب کو دیگر سماجی اداروں کی طرح ایک ادارہ قرار دیا ہے جس کا ایک خاص سماجی کردار ہے۔ درخائم کے خیال میں 'مذہب' کا ادارہ تاریخی اعتبار سے لوگوں کو اختلافات کے بوجود باہم جوڑنے کا کام کرتا رہا ہے۔ مذہب سے تعلق انسانوں میں ذاتی خواہشات اور امیدوں سے بلند ہو کر ایک اعلیٰ مقصد کے تحت جمع ہونے کی صلاحت پیدا ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے مذہب کا اصل وظیفہ بطور ایک جوڑنے والی طاقت (Integrativeforce) کا ہے۔[۷] مگر اب جدید دور میں انسانوں نے معاشرتی جڑاؤ کے متبادل ذرائع اپنانے شروع کر دیے ہیں اور درخائم کے نزدیک وہ قومیت (Nationalism) اور وطن پرستی (Patriotism) ہے جس نے روایتی مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ چنانچہ ان مفکرین کے خیال میں سماجی اداروں جیسا کہ معیشت اور سیاست میں آنے والی تبدیلیوں نے مذہب کے مستقبل کو محدود کر دیا ہے۔ دوسری طرف سماجی تصادم کے نمائندہ مفکرین نے کارل مارکس کی پیروی میں 'مذہب' کو کلی طور پر ایک منفی سماجی قدر قرار دیا ہے۔ چنانچہ قطع نظر اپنی اساس اور تعلیمات کے تمام مذاہب کا ایک ہی سماجی وظیفہ ہے اور وہ غریب اور کمزور کے مقابلے میں امیر اور طاقتور افراد کے مفادات کا تحفظ۔ کارل مارکس نے ایک فکری نظام متعارف کروایا جس کی بنیاد معیشت پر ہے مگر دانستہ یا غیر دانستہ طور پر دیگر نظام ہائے فکر بالخصوص اسلامی نظام فکر کو نظر انداز کر دیتا ہے جس میں انسان کی دیگر سماجی ضروریات کے ساتھ ساتھ معاشی محرومیوں کے ازالے کے لیے ایک معتبر طریقہ کار موجود ہے۔

باہمی تعامل (Inter-actionist) نظریے میں معاملات کو نچلی سطح پر دیکھنے کی روش نے ان سماجی عوامل کو نظر انداز کر دیا ہے جو اجتماعی سطح پر معاشروں کو متاثر کرتے ہیں۔ اس نظریے کے نمائندہ مفکرین زیادہ

تر فرد کے مذہبی رجحانات، فرد میں مذہبی تبدیلی کے مختلف مراحل نیز فرد کے نقطہ نظر سے مذہب کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ نظریہ امریکہ میں پروان چڑھا اس لیے مذہب کے باب میں ان مفکرین کا رویہ وہی ہے جیسا کہ مذہب کے ساتھ امریکی معاشرے میں روا رکھا گیا ہے۔ مذہب کے ضمن میں امریکی معاشرہ تضادات کا شکار دکھائی دیتا ہے اور یہ تضاد اس دوئی کی وجہ سے ہے جو سیکولرازم نے پیدا کی ہے۔[18]

جدید مغربی سماجیات میں 'مذہب کے سماجی کردار' کے بارے میں قائم کے گئے مفروضوں کو بھی آج سنجیدہ قسم کے سوالات کا سامنا ہے، ان مفروضوں میں سب سے نمایاں 'مذہبی دور' کے اختتام کے بارے میں ہے جیسا کہ آگسٹ کومٹ نے کہا تھا کہ زمانہ قبل از جدیدت میں کائنات اور انسانی معاشرے کی وضاحت مذہبی نقطہ نظر سے کی جاتی تھی جبکہ دورِ جدید میں 'علم سماجیات' مذہب کے متبادل کے طور پر کائنات، انسان اور معاشرے کے باہمی تعلق کو بیان کرے گی۔[19] آگسٹ کومٹ کے نزدیک انسان اور کائنات کی تعبیر میں فلسفہ بتدریج مذہب کی جگہ لے لے گا اور پھر بالآخر سماجیات فلسفہ کی جگہ لے لے گی۔ مغربی سماجیات کا یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا، مذہب آج بھی انسان کی فکری و سماجی زندگی کا اہم اور نمایاں طور پر حصہ ہے حتیٰ کہ ان معاشروں میں بھی جو اپنے آپ کو لادین کہتے ہیں۔[20]

۵۔ جدید سماجیاتی مناہج کی محدودیت

آج کے علمی منظر نامے میں مغربی علوم کو ایک آفاقی علمی روایت کے طور پیش کیا جاتا ہے کچھ اسی طرح کی سوچ سماجی علوم کے بارے میں بھی پائی جاتی ہے۔ جدید مغربی سماجیات اپنے دائرہ تحقیق اور سماجی تجزیے میں یہ دعویٰ کرنے سے قاصر ہے کہ یہ ایک آفاقی علمی روایت ہے بلکہ عمومی جائزے ہی سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مغربی مفکرین کے خیالات اور تحقیقات علاقائی محدودیت کا شکار ہیں جس کا اقرار خود مغربی مؤرخین علم بھی کرتے ہیں۔[21] جدید مغربی سماجیات کی علمی محدودیت ایک سنجیدہ معاملہ ہے جسے ماہرین سماجیات کے لیے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ علم سماجیات کی تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ خود مغربی دنیا (یورپ اور امریکہ) کے بعض علاقوں کی علمی روایت سے بھی کٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے جبکہ غیر مغربی معاشروں کے سماجی تجزیے اور تفہیم میں نہ صرف غیر مؤثر ہے بلکہ سماجی صورتِ حال کی درست توجیہہ کرنے سے قاصر ہے۔ مغربی سماجیات کے تحت وجود میں آنے والے خاص تحقیقی مناہج، غیر مغربی معاشروں کے تجزیے کے لیے فائدہ مند ثابت ہونے کی بجائے وہ ان معاشروں کی غلط صورت گری کر رہے ہیں۔ مغربی سماجیات میں پائے جانے والے اس نقص کی کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً، مغربی سماجیات میں جرم اور سماجی انحراف کا مطالعہ جن نظریات کے تحت کیا گیا ہے ان میں سے زیادہ تر امریکی شہروں نیویارک اور شکاگو کے سماجی تجربات اور تحقیقات پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ اپنے مخصوص علاقائی پس منظر کی وجہ سے یہ دیگر معاشروں میں پائے جانے والے جرائم اور سماجی انحراف کے

درست تجزیے سے قاصر ہیں جیسا کہ سوویت یونین، پاکستان، مصر اور انڈونیشیا۔[۲۲] یہی صورتِ حال ہمیں مطالعہ مذہب کے باب میں بھی نظر آتی ہے۔ جدید سماجیات میں 'مذہب' کے سماجی تجزیے میں چرچ کے نظام اور مختلف مسیحی فرقوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اسی طرح سماجی تبدیلی(social change) کی تفہیم کے لیے پیش کیے گئے نظریات یورپ اور امریکہ میں ہونے والی صنعتی ترقی اور جدیدیت کے پس منظر میں بیان ہوئے ہیں، چنانچہ اپنے خاص پس منظر کی وجہ سے جو کہ ایک اعتبار سے جانبدارانہ بھی ہے ان نظریات کو علمی سطح پر تنقید کا سامنا رہا ہے کیونکہ یہ یورپی اور امریکی سماجی تبدیلی کو بطور ایک معیار کے بیان کرتے ہیں۔[۲۳] مغربی جدیدیت پر تحقیق کرنے والے ایک مغربی مفکر کے مطابق یہ نظریات مجرد سماجی تجزیوں کی بجائے روایتی معاشیات کے مقابلے میں جدید معاشی طریقوں کو متعارف کروانے اور ان کی واضح حمایت پر مشتمل ہیں۔[۲۴] بعینہٖ صورتِ حال دیگر سماجی موضوعات کے سلسلے میں بھی نظر آتی ہے جہاں جدید مغربی سماجیاتی افکار سماجی تفاوت، شادی، خاندان وغیرہ کے بارے میں غیر مغربی معاشروں کو درپیش چیلنجز کی وضاحت کرنے سے قاصر ہیں۔ اگر ہم مغربی سماجیات میں محدودیت کی عمومی بحث کو ایک طرف رکھتے ہوئے صرف اسلامی معاشروں کی بات کریں یا ان علاقوں کو دیکھیں جو اسلامی ثقافت کے زیرِ اثر رہے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ کہ اسلامی ثقافت اور مسلم سماج کے بارے میں دورِ جدید کے مغربی مفکرین سماجیات، خاص طور پر سماجیات کے بانی سمجھے جانے والے مفکرین، کے ہاں کوئی باقاعدہ سماجیاتی مطالعہ نہیں پایا جاتا۔[۲۵] انھوں نے اسلام کو اپنے تجزیوں میں نہ صرف عموماً نظر انداز کر دیا ہے بلکہ جہاں کہیں انھوں نے اس پر بحث کی بھی ہے وہاں وہ غیر مسلسل اور اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسلام کو محدود اور ایک نامکمل سماجی نظام کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

۶۔ خلاصہ

سائنسی منہج جدید مغربی علوم میں ایک 'عقیدے' کی حیثیت رکھتا ہے۔ دیگر سائنسی علوم کے ماہرین کی طرح ماہرین سماجیات سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے تحقیقی دائرے میں آنے والی اشیاء(افراد، انسانی گروہ اور معاشرے) کا مطالعہ سائنسی منہج کے تحت کریں گے جس میں ان کے ذاتی جذبات اور رجحانات کا کوئی عمل دخل نہیں ہو گا، یہ جانتے ہوئے کہ ان کے دائرہ تحقیق میں آنے والی اشیاء 'انسان' ہیں جو کہ جذبات و احساسات سے عبارت ہیں، ماہرین سماجیات کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور نظریات کو نسلی و گروہی تعصبات سے پاک رکھیں۔ چنانچہ یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک ماہر سماجیات اپنے خیالات اور مفروضوں کی بنیاد خالص مشاہدات اور تجربات پر رکھے اور جو نظریہ مشاہدات و تجربات پر منحصر نہیں ہو گا اسے محض قیاس آرائی تصور کیا جائے گا اور سماجیاتی نکتہ نظر سے ناقابلِ قبول ٹھہرے گا۔ باوجود مذکورہ انتباہ کے جس کا ذکر 'سماجیات' پر لکھی جانے والی ہر کتاب میں موجود ہے ہم دیکھتے ہیں کہ مطالعہ سماجیات کے ضمن میں پیش کیے جانے

والے افکار و نظریات میں مغربی مفکرین کے خیالات جانبدارانہ اور غیر سائنسی ہیں اور اپنے حتمی نتائج کے اعتبار سے 'سماجیات' بہت حد تک ایک قیاسی علم رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظریاتی تعصبات پر قابو پانے کے لیے مختلف طریقہ کار وضع کیے گئے اور مؤثر کوششیں کی گئیں مگر یہ کہنا مشکل ہو گا کہ مغربی فکر سے ان تعصبات کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ گزشتہ سطور میں ہم نے دیکھا کہ مغربی سماجیات کے تینوں مناہج یا نظریات اپنے معاصر سائنسی علوم جیسا کہ طبیعات اور کیمیاء وغیرہ کے مقابلے میں قطعاً کسی مضبوط تجربی یا مشاہداتی اعداد و شمار پر مشتمل نہیں ہیں جیسا کہ سماجیاتی تحقیق میں عموماً مغربی مفکرین کے ہاں دعویٰ کیا جاتا رہا ہے۔ مزید یہ کہ مغربی علم سماجیات کی بانیوں کے مذہب کے سماجی کردار کے بارے میں مفروضے نہ صرف غلط ثابت ہوئے بلکہ مذہب کی طرف لوگوں کی مراجعت تیزی سے بڑھتی نظر آئی جس نے مذہب کے سماجی کردار کو ایک دفعہ پھر موضوع بحث بنا دیا ہے۔ دوسری طرف مغربی سماجیات کی علاقائی محدودیت اسے ایک آفاقی علم قرار دینے میں مانع ہے۔ ایسے میں ماہرین سماجیات کو حقیقی معنوں میں مطالعہ سماجیات کے ایسے راہنما اصولوں کی ضرورت ہے جو علاقائی محدودیت، جانبداری اور تعصب سے پاک ہوں۔

حوالہ جات

1. John Urry, Sociology Beyond Societies: Mobility for the twenty-first century, (London: Routledge, 2000), p. 23
2. Richard T.Shaefer,Sociology: A Brief Introduction(New York: McGraw-Hill, 2004), p. 8
3. IlyasBa-Yunus and Farid Ahmad, Islamic Sociology: An Introduction(Cambridge: The Islamic Academy, 1985), p. 6
4. Emile Durkheim, The Elementary Forms of Religious Life, Karen E. Fields, (tr.) (New York: The Free Press,1995) p. 217, 225
5. Bellah, Robert N., “Civil Religion in America”Journal of the American Academy of Arts and Sciences,96:1 (Winter-1967), 1–21

6. Davis, Kingsley "The Myth of Functional Analysis as a Special Method in Sociology and Anthropology," American Sociological Review, vol. 24 (1959), 757

7. Malcolm Hamilton, "Religion and Solidarity: Emile Durkheim," in The Sociology of Religion(London: Routledge, 2001), p. 115

8. Ilyas Ba-Yunus and Farid Ahmad, Islamic Sociology: An Introduction, p. 6

9. Ralf Dahrendorf, "Toward a Theory of Social Conflict," Journal of Conflict Resolution, vol. 2, (1958), 170-183

10. David McLellan (ed.) Karl Marx: Selected Writings(Oxford: Oxford University Press, 2000),p. 371

11. Malcolm Hamilton, "Religion and Ideology: Karl Marx," in The Sociology of Religion(London: Rout ledge, 2001), p. 91

12. M. B. McCuire,Religion: The Social Context(Belmont, CA: wads worth, 1997), p. 206

13. Peter R.Killeen, "The Four Causes of Behavior"CurrDirPsychol Sci.10 (4),(Aug-2001)136–140.
https://www.ncbi.nlm.nih.gov/pmc/articles/PMC2600470/
Accessed on :29-07-2019

14. Andersen and Tylor, Sociology: Understanding a Diverse Society(London: Wordsworth, 2002), p. 111

15. Richard T.Shaefer,Sociology: A Brief Introduction, p. 16

16. Peter L.Berger, The Sacred Canopy: Elements of a Sociological Theory(New York: Doubleday, 1967), p. 25

17. Durkheim, Emile, The Elementary Forms of Religious Life, Karen E. Fields (tr.), New York: The Free Press, 1995), pp. 208, 341

18. Waldo W. Burchard, (1963) "Role Conflicts of Military Chaplains," American Sociological Review, 19 (October-1963), 528-35
19. Bryan Wilson,Religion in Social Perspective(New York: Oxford University Press, 1992), p. 2
20. Sammuel P. Huntington,Who Are We: The Challenges to American's National Identity(New York: Simon & Schuster, 2004), p. 81
21. Robert M. Marsh,Comparative Sociology(New York: Brace and World, 1967), p. 19
22. IlyasBa-Yunus and Farid Ahmad,Islamic Sociology: An Introduction, p. 14
23. M. Hatcher, "A Review of I. Wallerstein's The Modern World System,"Contemporary Sociology, Vol. 4 (May-1975): 217-222
24. AlejandroPortes, (1973) "The Factorial Structure of Modernity: Empirical Replications and a Critique,"American Journal of Sociology, Vol. 79, 1 (1973): 15-44
25. Bryan S.Turner, (1974) Weber and Islam(London: Routledge and Kegan Paul, 1974), p. 1,2